© rasailojaraid.com

قسط:۴

ورق ورق زندگی

پروفیسر خالد شبیر احمد

”یادِ خدا“ اور نذیر مجیدیؒ:

”المنیر“ کے بعد دوسرا اہم اخبار ”یادِ خدا“ ہے جو دادا جان کی ہی تجویز اور مشورے کے مطابق ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر عزیز علی کی ادارت میں پہلے سرگودھا اور پھر چنیوٹ سے شائع ہونا شروع ہوا۔ چنیوٹ میں قیام کے دوران یعنی ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۴ء تک والدِ محترم نذیر مجیدی ”یادِ خدا“ سے وابستہ رہے۔ ”یادِ خدا“ کے ساتھ والد محترم نذیر مجید کا جو خصوصی تعلق رہا اس کے بغیر نہ یادِ خدا کی کہانی مکمل ہوتی ہے اور نہ ہی والدِ محترم کی زندگی کا قصہ۔ نذیر مجید کا یادِ خدا کے ساتھ تقریباً وہی تعلق رہا جو ”زمیندار“ کے ساتھ ظفر علی خان یا پھر روزنامہ انقلاب کا تعلق مولانا غلام رسول مہر کے ساتھ تھا۔ بنیادی وجہ دونوں کے وہ خصوصی تعلقات تھے جن کا ذکر پچھلی قسط میں بیان ہو چکا ہے۔ انہی تعلقات کا تقاضہ تھا کہ یادِ خدا کے ساتھ وابستہ رہا جائے۔ چنانچہ والدِ محترم یادِ خدا میں ”تلخ وشیریں“ کے عنوان سے یادِ خدا میں مسلسل لکھتے رہے۔

”شہرلبِ دریا“ کے مصنف کی درج ذیل تحریر سے بھی بات مزید واضح ہوتی ہے: ”۱۹۳۸ء میں پاسبان بند ہو گیا جس کے بعد نذیر مجیدی چنیوٹ چلے آئے اس وقت تک ”المنیر“ طاقِ نسیاں کی زینت بن چکا تھا اور اُن کے والد محترم عملی صحافت سے کنارہ کش ہو کر اپنی زندگی انجمن اسلامیہ چنیوٹ کے لیے وقف کر چکے تھے۔ نذیر مجیدی نے چنیوٹ میں ہی قیام کا فیصلہ کیا اور ڈاکٹر عزیز علی کے اصرار پر ہفت روزہ ”یادِ خدا“ کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور بہت جلد اپنے زورِ قلم اور شوخیٔ تحریر کی بنا پر قبولِ عام کی سند حاصل کر لی۔ ”تلخ وشیریں“ کے عنوان سے چھپنے والے کالم میں طنز ومزاح کی کاٹ کے ساتھ ساتھ گہرے سماجی شعور کی جھلک ملتی تھی۔ روزمرہ کے موضوعات کو اس ادیبانہ چاشنی کے ساتھ بیان کرتے کہ ان کے کالم کا انتظار کیا جاتا۔ اس کالم میں محبت کی شرینی سے لے کر نفرت اور رقابت کی تلخیاں تک شامل رہتیں۔ لیکن ان کا انداز ایسا شگفتہ تھا کہ بہت سی تلخیوں کو بھی جامۂ شیریں پہنا دیتے۔ سیر وسیاحت اور وسیع مطالعہ کی بنا پر اُن کے پاس موضوعات کی کمی نہ تھی۔ انہوں نے ایک دنیا کو بستے ہوئے دیکھا تھا۔ اس لیے ان کا قلم تہذیب اور زندگی کے شعور سے آشنا تھا۔ ”یادِ خدا“ چونکہ زیادہ تر مقامی مسائل کا احاطہ کرتا تھا۔ اس لیے نذیر مجیدی بھی اکثر اوقات شہر کے کوچہ وبازار اور مقامی بلدیہ کی کارگزاری کو موضوعِ تحریر بناتے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

چند کالم:

”ایک دفعہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ رات کو چنیوٹ آئے۔ شہر میں روشنی گل تھی اور حسب معمول تاریکی نے پردے ڈال رکھے تھے۔ آج کل کی زبان میں کہنا چاہیے کہ ”بلیک آؤٹ“ ہو رہا تھا۔ اس پر راستے کی بلندی اور پستی مستزاد تھی۔ شاہ صاحب قدم کہیں رکھتے پڑتا کہیں۔ طبیعت بذلہ سنج واقع ہوئی تھی۔ یہ عالمِ زیر وبالا دیکھ کر فرمانے لگے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سب نابینا رہتے ہیں اور اس مناسبت سے تو اس شہر کا نام حافظ آباد ہونا چاہیے تھا۔

راقم حروف کا خیال ہے کہ شاہ صاحب کا تجویز کردہ نام چنیوٹ کا رات کا ہونا چاہیے کیونکہ جو تکلیف صاحب موصوف کو جھیلنی پڑی وہ عموماً رات کی تاریکی میں ہوتی ہے۔ دن کو سب نابینا، بینا ہو جاتے ہیں۔ راستے نظر آنے لگتے ہیں اور قدم درست پڑتے ہیں اور رات جتنی تکلیف نہیں ہوتی۔ البتہ دن کو شہر کی صفائی کو مدِّنظر رکھا جائے تو ''گندپور'' ''کوڑا گنج''، ''کرکٹ آباد''، ''اروڑی شہر'' جیسے نام موزوں ہوں گے۔'' (مئی ۱۹۴۳)

زبان سادہ اور روانی تحریر نذیر مجیدی کے کالموں کی خصوصیات تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کالم ہر خاص و عام کی نگاہ میں پسندیدہ ٹھہرتے تھے۔ سنجیدہ موضاعات پر بھی وہ اپنے مخصوص انداز میں اس شگفتگی سے اظہار خیال کرتے کہ تحریر بوجھل نہ ہونے پاتی اور حرفِ آخر تک دلچسپی برقرار رہتی۔ بات سے بات پیدا کرنے میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا اور پھر جب اس میں ظرافت کا رنگ شامل ہوتا تو کالم کو چار چاند لگ جاتے ایسا ہی ایک اور کالم پیش نذر ہے:

''شاعر پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا۔ لیکن میونسپل کمشنر پیدا نہیں ہوتا بنایا جاتا ہے۔ اگر اس ذاتِ شریف کی تخلیق کا دیانتدارانہ تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اوصاف انسانی سے بہت بلند قسم کی مخلوق ہے۔ یہ خدائی کا وہ مجازی خدا ہے جسے خدائی اپنے ہاتھوں سے ''خدا'' بنا کر بعد میں اپنے پر شرماتی ہے اور پچھتاتی ہے۔

چونکہ آج کل رواج کی پابندی ہے، عام طور پر جس خاندان کا کوئی فرد حج کر آئے تو اس خاندان کے تقریباً سب افراد حاجی کہلانے لگتے ہیں۔ بعینہٖ میونسپل کمشنر کا بیٹا، پوتا، بھانجا، بھتیجا بھی چوہدری کہلانے لگتا ہے۔ تاکہ ہاتھ آئی ہوئی دولت سے زمانہ محروم نہ کر دے اور یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوتا رہے، بعض ستم ظریف میونسپل کمشنر کو میونسپل کنستر بھی کہہ دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی توجیہ یا تو یہ ہوسکتی ہے کہ جس طرح کنستر میں کئی چیزیں ڈالی جاسکتی ہیں میونسپلٹی کی ہر چیز اور اس کے علاوہ تیل اور کھانڈ بھی، میونسپل کمشنر اور اس کے خاندان کے ہر فرد کی دستبرد اور دستِ تصرف میں آسکتی ہے، یا جس طرح کنستر بعض اوقات خالی ہو کر ڈھول کا ڈھول رہ جاتا ہے اس طرح میونسپل کمشنر بھی میونسپل کمشنری کرتے کرتے ذہنِ رسا اور عقل و خرد سے خالی ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ کنستر کہلاتا ہے یہ میونسپل کمشنر کہلاتا رہتا ہے۔

جس طرح پارس جس شے سے چھو جائے اس کو سونا بنا دیتا ہے۔ بالکل اس طرح میونسپل کمشنر کے پاس بیٹھنے اٹھنے والے بھی سکتر، سپرنٹنڈنٹ چونگی وغیرہ بن جاتے ہیں۔ لیکن اگر قسمت یاوری کرے تو بعض دفعہ میونسپل کمشنر بھی بن جاتے ہیں۔ لیکن یہ گدا کی سکندری کچھ اتنی مفید ثابت نہیں ہوتی کیونکہ ہر بات میں یہ میونسپل کمشنر اپنے محسن کا محتاج رہتا۔ اور اس کی رضامندی کے سوا کوئی مفید خدمت سرانجام نہیں دے سکتا۔''

نذیر مجیدی کا بے باک قلم خوش بیانی اور ظرافت کے پردوں میں استعماری قوتوں سے بھی نبرد آزما رہا۔ آزاد دنیا کی سیر و سیاحت نے انہیں آزادی کی نعمتوں سے خوب آشنا کیا تھا۔ ہر باحمیّت شخص کی طرح وطن کی غلامی کا احساس ان کے لیے کسی کسک سے کم نہ تھا۔ جو دل و جان کو ہر وقت بے چین رکھتی۔ انگریزوں کے نسلی افتخار اور منافقانہ طرزِ علم پر مبنی حکمت عملی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''فرنگی اللہ میاں کی حقیقی غلیق ہے اور ہندی سوتیلی غلیق وہ ابیض یہ اسود، یہ حسن وخوبی کی کان یہ عیوب کا پلندہ، اس لیے ہر ہندوستانی کا غلامی پر قانع رہنا اس کا قدرتی فریضہ ہے۔ آزادی کی دیوی ہندوستان کے غلام ابن غلام کے ہاتھ چھوکر ناپاک نہیں ہوسکتی۔ وہ یورپ میں پیدا ہوئی وہیں پلی اور سنبھلی۔ اسے دیس کا آب ودانہ موافق ہے۔ ہندوستان اس کا وطن نہیں۔ اس لیے اس کا یہاں گزر بھی ممکن نہیں۔ چرچل نے کہا کہ میرے نزدیک غلام صرف وہ ہیں جن کی آزادی کو ہٹلر جیسے ڈاکو نے لوٹا۔ جن کی آزادی کو انگریز نے سلب کیا وہ غلام ہماری ملکیت ہیں۔ فی الحال ہمارے اپنے غلاموں کا معاملہ درپیش نہیں بلکہ ان غلاموں کا ہے جو ہٹلر کی نازی بھٹی میں تازہ بتازہ تیار ہوئے ہیں۔ اور بے دست و پا ہٹلر کے رحم وکرم پر پڑے ہیں۔ لہٰذا برطانیہ دنیا بھر میں کمزور ممالک کا واحد معان، مددگار اور روئے زمین کی آزادی کا اور امن کا نگہبان اور اجارہ دار ہے۔ ان کی حفاظت اور نگہبانی میں ہر ممکن ذریعہ استعمال کرے گا اور ہندوستانی کسی شمار وقطار میں کیوں آئے، اس کے ساتھ جو مواعید کیے جا چکے ہیں انہی کی پابندی کی جائے گی۔ لہٰذا ہر ہندوستانی چرچل کی درسگاہ میں کھڑا رہ کر وقت اور موقع کا انتظار کرے۔''

نثر کے ساتھ شاعری کا میدان بھی نذیر مجیدی کی دسترس میں تھا۔ تیکھا لہجہ اور برجستہ انداز ان کے نمایاں اوصاف تھے۔ روزمرہ کے عام موضوعات ردیف اور قافیے کے پیمانوں میں سج کر دو آتشہ ہو جاتے تھے۔ وہی بے باکی اور بے ساختگی جوان کی تحریروں میں نظر آتی ہے ان کی نظموں میں بھی موجود ہے۔ ایک نظم بعنوان ''لیڈری'' کے چند اشعار

جو لیڈری کی تمنا ہے تو چالبازی کر — کسی سے مکر کسی سے بہانہ سازی کر
کسی پہ اپنی لیاقت کا رعب طاری کر — کسی پہ طعن کسی کی گلہ طرازی کر
کبھی دکھا کسی تقریر دلپذیر کے رنگ — کبھی زبانِ قلم سے کرشمہ سازی کر
کبھی لڑا کے الیکشن کسی کو غارت کر — کسی سے ممبری کا عہدِ سرفرازی کر
تو آج جس کی حمایت میں گہر افشاں — کل اس کی خوب خبر لے کے بے نیازی کر
غرض کہ لیڈری کر اور نام پیدا کر — اور ان بہانوں سے اپنا طعام پیدا کر

نذیر مجیدی ایک طویل عرصہ تک یادِ خدا میں اپنی شوخیٔ تحریر کے پھول کھلاتے رہے۔ ڈاکٹر عزیز علی سے ان کی دوستی ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر دو صاحبانِ قلم نے چنیوٹ کی ٹھہری ہوئی زندگی میں فکر وعمل کے بہت سے بھنور پیدا کیے۔ ان کی زندگی خدمتِ خلق اور ترویج علم کا پرتَو تھی۔ جس طرح ہفت روزہ یادِ خدا اور ڈاکٹر عزیز علی لازم وملزوم تھے اسی طرح یادِ خدا اور ''تلخ شیریں'' میں بھی چولی دامن کا ساتھ تھا۔ یہ اخبار اور کالم رفتہ رفتہ ان دونوں کی پہچان بن گئے۔ اس کا اظہار نذیر مجیدی اس طرح کرتے ہیں: ''جس طرح مولانا ظفر علی خان کو بعض ناواقف لوگ اخبار ''زمیندار'' کے مالک ہونے کی وجہ سے زمیندار کے نام سے اور مولانا غلام رسول مہر کو اخبار ''انقلاب'' کی وجہ سے انقلاب کے نام سے پکارتے ہیں۔ اسی طرح اب ڈاکٹر عزیز علی کو ''یادِ خدا'' کی وجہ سے یادِ خدا کا نام دے دیا گیا ہے اور بعض اجنبی لوگ جب آپس میں ان کے متعلق تذکرہ کرتے ہیں تو ہم نے اپنے کانوں سے یہ کہتے سنا ہے کہ ''یادِ خدا'' سائیکل پر سوار تحصیل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والی سڑک پر جا رہا تھا'' '' آج مجمع میں یادِ خدا نے خوب تقریر کی بالکل اسی طرح جس طرح لاہور میں بعض لوگ مولانا غلام رسول مہر کو موٹر چلاتے ہوئے دیکھ کر کہا کرتے ہیں ''انقلاب موٹر خود چلاتا ہے''

جب چنیوٹ سے والدِ محترم نے اخبار ''المنیر'' جاری کیا اور پھر اسے جھنگ لے گئے تو اس وقت راقم الحروف کی عمر تین چار سال کی ہوگی۔ جس طرح بعض احباب آج کل مجھے آتا دیکھ کر یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ حضرت ''تلخ و شیریں'' تشریف لا رہے ہیں۔ جس طرح شاعر حضرات کا نام ڈوبنے اور تخلص ابھرنے لگتا ہے ہمارا بھی یہی حال ہے کہ ہمارے نام ڈوب رہے ہیں اور اخبار اور کالموں کے نام ابھر رہے ہیں۔

والدِ محترم کی تحریروں کا رُخ اگرچہ مقامی مسائل کی طرف زیادہ رہا۔ لیکن انہوں نے ملکی اور بین الاقوامی مسائل کو بھی اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ ہندوستان کی دو سیاسی شخصیتوں میں جب سیاسی رقابت اپنے عروج پر تھی گاندھی اور سبھاس چندر بوس آمنے سامنے تھے تو اُن کی سیاسی اس رقابت کو طنز و مزاح کے لبادے میں آپ نے اس طرح پیش کیا۔

'' آج کل بنگال اور واردھا کے درمیان بڑے مزے کا رن پڑا ہوا ہے۔ گاندھی اور سبھاس چندر بوس میں زور آزمائیاں شروع ہیں۔ ایک طرف پرانا اور آزمودہ کار پہلوان ڈنڈ پیل رہا ہے، دوسری طرف بالکل جوان پٹھا مگدر ہلا ہلا کر اور گرز گھما گھما کر اسے مرعوب کرنا چاہتا ہے۔ ایک طرف تجربات کے داؤ پیچ چل رہے ہیں۔ دوسری طرف دستور اور اصول اور بات کا پاس خم ٹھونکے ہے۔ ایک طرف روحانی کمالات کے لپیٹوں میں پالیسی اور خالص ذاتی وقار کے استقلال کی تمنائیں جلوہ فرما ہیں، دوسری طرف جوشِ شباب کے ساتھ ساتھ خلوص و ایثار کا ادعا کارفرما ہے۔ ایک طرف فریبِ نظر کے لیے فقیر اور فقیر کی لنگوٹی ہے جس میں کسے خبر کیا کیا استادیاں پنہاں ہیں، دوسری طرف نام نہاد جوش، ولولہ ہے پردہ مصروفِ تگ و دو۔ یہ دونوں سیاسی گرو و چیلہ عوام کو رام کرنے کے لیے اپنی اپنی سحر طرازیوں میں مشغول ہیں۔ بنگال کا طفلِ مکتب واردھا کے استادِ کہنہ سال کو نیچا دکھانے کے لیے اپنی انتہائی شوخیوں کو کام میں لائے گا۔ چنانچہ بنگال میں اس کے لیے فضا کو کافی حد تک سازگار بنایا جا چکا ہے۔ نہ معلوم اب دربارِ واردھا سے کیا احکام نافذ ہوتے ہیں اور دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔'' ع۔ اس کھیل میں تعینِ مراتب ہے ضروری

(اس دنگل میں بھی بظاہر تو گاندھی جی ہی کو فتح ہوئی جو انگریزوں کی ملی بھگت سے ساری عمر کاروبارِ سیاست چلاتے رہے اور محض عدم تشدد کے فلسفہ کی وجہ سے فلاسفر بن بیٹھے۔ جب کہ اصل حریف انگریزوں کے سبھاس چندر بوس ہی ثابت ہوئے۔ جو عدم تشدد کی بجائے تشدد کے حامی بن کر ملک بدر ہوئے اور آزاد ہند فوج کے بانی بن کے آسمان حُریّت کے درخشندہ ستارے کی صورت میں آج بھی جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔)

جن دنوں ہفت روزہ یادِ خدا اپنی جرأت مندانہ حکمت عملی کے طفیل چنیوٹ کے مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن بنا ہوا تھا ایک ہندو معاصر ''ہمدرد'' بھی منظر عام پر آ گیا۔ یادِ خدا کی مقبولیت سے بھنا کر ہندوؤں نے ۱۹۴۰ء میں یہ جریدہ نکالا۔ لیکن اس کا معیار یادِ خدا کا تحریروں تک نہ پہنچ سکا۔ ہر دو پرچوں میں اکثر ٹھنی رہتی۔ اپنے اپنے نکتہ نظر کے مطابق خوب کانٹے دار مضمون لکھے جاتے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے زورِ قلم بڑھ چڑھ کر استعمال ہوتا۔ اسی سلسلہ میں نذیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مجیدی لکھتے ہیں: ’’چنیوٹ سے کچھ عرصہ سے ہمدر کے نام سے ایک ماہوار پرچہ جاری ہے۔ اس کے بانی ایک ہندو کاتب ہیں۔ جنہیں پہلے پاٹنی جی کہا جاتا تھا مگر ایڈیٹری کے شوق نے انہیں ساحر بنا دیا۔ اس رسالے کا نام ہمدرد ہے اور جس سبھا کی سرپرستی انہیں حال ہی میں حاصل ہوئی ہے اسے ہمدرد سبھا کہا جاتا ہے۔ اس ایڈیٹر جو ماشاءاللہ سب ’’سخن طراز‘‘ قسم کے لوگ ہیں اپنے نام کے ساتھ ایک عدد تخلص بھی لکھنے کے عادی ہیں۔ تخلص اور صاحبِ تخلص میں جو روحانی ’’ہندی اردو‘‘ تعلق ہے اسے پڑھ کر ان حلاوتوں سے اپنے ادبی مذاق کو لطف اندوزی کا موقع پہنچایئے، امرناتھ ساحر (ایڈیٹر)، نہال چند چمن (چیف ایڈیٹر)، ہربنس لعل ملہوترہ (سابق جائنٹ ایڈیٹر ملاپ لاہور)، لالہ منوہر لعل شہید (مدیر اعزازی) غور طلب الفاظ مدیر اعزازی اور منوہر لعل کے شہید ہے۔ رام جی داس فرحت (سیکنڈ ماسٹر)، جنک راج حاضق۔ ان صاحب کا عہدہ عدم پتہ ہے۔ قیاس ہے کہ لفظ حاذق عموماً طبیب لوگوں کی دم کے طور پر استعمال ہوتے دیکھا ہے۔ شاید ڈاکٹر عزیز علی کے ڈاکٹر کے لفظ کے مقابلے کے لیے حاذق استعمال کیا گیا ہو، یا آپ ’’حکیم جی‘‘ بھی ہوں۔ واللہ عالم والصواب

مندرجہ بالا عملہ کی فہرست پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ شعرا کرام تمام کے تمام ہندی نژاد ہیں مگر تخلص سب کے سب عربی فارسی سے مشتق ہیں۔ تخلص کے انتخاب تک تو ان ہندی کی شیدائیوں کو عربی فارسی کے الفاظ سے خوف نہیں آتا مگر جب ایڈیٹر اور شاعر ہندی اور اردو کی ٹانگ توڑنے بیٹھتے ہیں تو عربی اور فارسی کے الفاظ اس تنگ دلی اور نفرت کا اظہار کرتے ہیں کہ عیاذاً باللہ۔ مثلاً پہلے سے قاعدہ چلا آتا ہے کہ مضمون، افسانہ، غزل یا نظم کے مصنف کا نام درج کرتے وقت لفظ از استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر معاصر ہمدرد نے اس کی جگہ ’’لیکھک‘‘ لکھنا شروع کر دیا ہے۔ لفظ ’’استانی‘‘ عام لفظ ہے مگر بجائے استانی لفظ ’’اَدھیا پکہ‘‘ کا استعمال شروع ہے اور ہیڈ معلّمہ کو ’’ہیڈ اَدھیا پکہ‘‘ کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ اس قدر ثقیل ہے کہ زبان پٹخیاں کھانے لگتی ہے۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ چار شہسوار بڑی شان و شوکت سے گھوڑوں پر سفر کر رہے تھے۔ کہ ایک شہر سے گزر ہوا۔ دروازے کا چوکیدار ان کی شاہانہ ٹھاٹھ سے مرعوب ہو کر مزاحم نہ ہوا۔ اسی اثنا میں ایک اور مسافر جو گدھے پر سوار تھا آن پہنچا، چوکیدار نے اسے روک کر پوچھا تم کون ہے۔ اس نے بھی شہسواروں کے طمطراق کو قائم رکھتے ہوئے جواب دیا کہ میں پانچواں سوار ہوں، یہی حال ’’ہمدرد‘‘ کا ہے یہ بھی سواروں میں پانچواں ہے، ہر معاملہ میں ناٹک اڑانا اس کا شیوہ ہے۔ ہر معاملہ کو فرقہ وارانہ عینک سے دیکھے گا اور خواہ مخواہ اپنی تنگ دلی اور کم ظرفی کا ثبوت دینے کے لیے فرقہ پرستی کا رنگ دے کر بات کا پتنگڑ بناتے نہ شرمائے گا۔ (۲۵/ جولائی، ۱۹۴۱ء)

اس معاصرانہ جنگ کا یہیں اختتام نہیں ہوتا بلکہ مدیر ہمدرد کا محاسبہ کرتے ہوئے ان کے شوق کتابت سے لے کر ہمدرد سے وابستگی تک کو موضوعِ سخن بناتے ہوئے لکھتے ہیں: ’’کاتبوں کی کئی قسمیں ہیں۔ بعض شرگیں رقم، بعض رنگیں رقم تو بعض زریں رقم۔ آخری قسم کا تبان ذرا خطرناک قسم ہے کیونکہ انہیں زریں رقم طرازی کے ساتھ ساتھ الفاظ میں اپنی قوتِ دستبرد کی جولانیاں دکھانے کی بھی لت ہوتی ہے۔ چونکہ عموماً ان کا فرضِ منصبی لکھنا ہوتا ہے لہٰذا لڑکپن میں انہیں صرف اس بات کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ پڑھنے کے لیے نہ ان کو وقت ملتا ہے اور نہ یہ اس کی پرواہ کرتے ہیں۔ کتابت کے دوران میں یوں قلم بدست ہو کر بیٹھتے ہیں گویا میدانِ کارزار میں سپاہی خنجر بکف ہو...... مکھی پر مکھی مارنے کی انہیں بہت مشق ہوتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے اور سنا ہے کہ ان کے پس یہ استادی ٹوٹکہ بھی موجود ہے کہ جو لفظ نہ پڑھا جائے اس کو پڑھنے کی کوشش میں وقت ضائع کرنے کی بجائے اپنے ذہنِ رسا سے کام لے کر اسی شکل وصورت کا کوئی اور حرف جڑ دینا عین کامیابی اور زریں رقمی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ ٹوٹکہ سینہ بہ سینہ اس گروہ میں محفوظ چلا آتا ہے۔ مثلاً اگر لفظ ”امت“ شکستہ لکھا ہوا اور پڑھنے میں ذرا دقت محسوس ہوتی تو جھٹ اسے بیک کششِ قلم ”آفت“ لکھ دیں گے۔ اسی طرح ”اخبار“ کو ”اغیار“ ”واچ“ کو ”ازواج“ ”دلیر“ کو ”دلبر“ ”عدالت“ کو ”عورت“ ”یتیم“ کو ”تیمّم“ وغیرہ وغیرہ۔

بعض اوقات ان کی یہ حرکت بے حد مضحکہ خیز ہوا کرتی ہے کاتب اگر صرف کاتب ہی ہو تو خیر سلّا۔ خدا بچائے اگر کاتب کو ایڈیٹری کا شوق چرائے اور وہ ایک عدد اخبار بھی جاری کر دے اور ”ضرورت ایجاد کی ماں“ کے مصداق اپنے نام کے ساتھ زریں رقم لکھتے لکھتے ”ساحر“ ”باہر“ ”ظاہر“ کے دم چھلے لگا کر شاعر بن جائے تو پھر اس کا وہی حشر ہوتا ہے۔ جو گنجے کو ناخن مل جانے سے ہوا کرتا ہے۔ اگر باور نہ آئے تو ”ہمدرد“ کے ”پاٹنی“ جی سے استفسار کر لیں۔“

پنجاب کے وزیر ترقیات و مالیات سر چھوٹو رام نے زمینداروں اور کسانوں کے لیے جو خدمات سرانجام دیں اور جس طرح انہیں سود اور بیاج کے عفریت سے نجات دلائی اس کی بنا پر پنجاب بھر میں انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ انہوں نے پنجاب اسمبلی میں اور اسمبلی سے باہر کسی مردِ آہن کی طرح زمینداروں کی حمایت میں کانگریسی اور مہا سبھائی ممبران اسمبلی کا جس طرح مقابلہ کیا وہ پنجاب کی پارلیمانی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سر چھوٹو رام نے چنیوٹ کا دورہ کیا تو اہلیان چنیوٹ نے ان کے استقبال میں دیدہ و دل فرش راہ کر دیے اور نذیر مجیدی مدیر معاون یادِ خدا نے غریب دہقانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے ان الفاظ سے ان کا خیر مقدم کیا۔

خدا کے لطف و کرم کا پیام آیا ہے　　یہ خوب ساقیٔ محشر خرام آیا ہے
نوائے عیش لیے فیضِ عام آیا ہے　　کہ جس کے آتے ہی گردش میں جام آیا ہے
وزیر مال سا عالی مقام آیا ہے　　زہے نصیب کہ سر چھوٹو رام آیا ہے
میرے وطن کی زمیں آج گل بداماں ہے　　ہر ایک فرطِ مسرت سے آج شاداں ہے
جدھر نگاہ اٹھاؤ خوشی کا ساماں ہے　　پیام عیش زمانے کے نام آیا ہے
زہے نصیب کہ سر چھوٹو رام آیا ہے　　زہے نصیب کہ دہقاں کا غمگسار آیا ہے
یہ بن کے قوم کا اک ننگ و نام آیا ہے　　وزیر مال سا عالی مقام آیا ہے
زہے نصیب کہ سر چھوٹو رام آیا ہے

جب والد صاحب سر چھوٹو رام کی چنیوٹ آمد کے موقع پر چنیوٹ سرکٹ ہاؤس میں منعقدہ ایک تقریب میں نظم پڑھ رہے تو میں ان کے ساتھ سٹیج پر بیٹھا لوگوں کے خوش کن تاثرات سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ سر چھوٹو رام واقعی قد میں چھوٹے اور رنگ کے بھی قدرے سیاہ ہی تھے لیکن اپنی خوبیوں کے اعتبار سے بڑے عظیم اور دراز قامت تھے۔ کہ لوگ ان کے کارناموں کی وجہ سے بلا امتیازِ رنگ و نسل مذہب و ملت اپنی آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یادِ خدا میں ایک کالم یہ بھی چھپا جو نذر قارئین کرنا ان سیاسی حالات میں خصوصی طور پر بہت ضروری ہے۔

”مجلس احرارِ اسلام ہندوستان میں حکومت الٰہیہ یعنی قرآنی حکومت اور قرآنی نظم و نسق کو جاری کیے جانے کی علمبردار ہے۔ خاکسار تحریک اور اس کا بانی علامہ مشرقی غلبہ اسلام کا مدعی ہے۔ مسلم لیگ پاکستان کا مطالبہ کر رہی ہے۔ ہماری رائے میں ان تینوں مطالبات میں لفظی ہیر پھیر کے سوا کوئی خاص فرق نہیں اور تینوں کا مقصد ایک ہے ہم مجلس احرارِ اسلام اور تحریکِ خاکسار اور اس کے بانی کو یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اگر وہ فی الحقیقت ایمانداری کے ساتھ قرآنی حکومت کے قیام اور غلبۂ اسلام کے متمنی ہیں تو انہیں اس وقت مسلم لیگ کی مخالفت کرنے کی بجائے دل و جان سے اس کی حمایت کرنی چاہیے کہ مسلم لیگ کا مطالبۂ پاکستان غیر مسلم اور انگریز مجبور ہو جائیں۔

جب یہ مطالبہ تسلیم کر لیا جائے گا تو اس وقت کوئی مسلمان قرآنی حکومت (حکومت الٰہیہ) کے قیام اور غلبۂ اسلام کا منکر ہونے کی اگر جرأت کرے گا تو خواہ وہ مسلم لیگی ہو، منہ کی کھائے گا اور مسلم عوام، مجلس احرارِ اسلام اور خاکسار تحریک کے مطالبات قرآنی حکومت (حکومت الٰہیہ) کے قیام اور غلبۂ اسلام کی ہی تائید کریں گے اب بھی وقت ہے کہ ”صبح کا بھولا ہوا شام کو گھر آئے تو وہ بھولا نہیں ہوتا“ کے مصداق مسلم لیگ کے مخالفین مسلم لیگ کی مخالفت چھوڑ کر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں اور مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کو غیر مسلم اور انگریز سے منوانے میں مسلم لیگ کا ساتھ دیں۔“

اس تحریر پر میرا تبصرہ فقط میرے ہی دو شعروں میں مضمر ہے کہ زیادہ تحریر کرنے سے کیا فائدہ۔ صورت حال اب کھل کر سامنے آ چکی ہے کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ تبصرے کی محتاج ہو۔

لے گئے لوٹ کے گھر بار محافظ میرے
رہ گیا خوف فقط میرے مکاں میں رکھا
ہوئی تنویر سحر آنکھ کا دھوکا خالد
شہر حسرت ہے میرے کاسۂ جاں میں رکھا

ایک دفعہ ڈاکٹر عزیز علی کے بڑے بیٹے ڈاکٹر سرفراز علی والدِ محترم کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کر رہے تھے تو انہوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا۔

سوال تھا: سنا ہے چچا جان آپ پاکستان کے خلاف تھے؟

جواب تھا: ”نہیں بیٹا ہم پاکستان کے مخالف نہیں تھے ہم نے تو فقط پاکستان بنانے والوں پر عدم اعتماد کا اظہار کیا تھا کہ ان سے یہ پاکستان نہیں بن پائے گا۔ جو یہ بیان کرتے ہیں۔ ہمارا یہ عدم اعتماد وقت کے جج نے سچ کر دکھایا کہ وقت سب سے بڑا جج ہوتا ہے اور وقت جو بھی فیصلہ کرتا ہے درست ہوتا ہے۔“

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

(جاری ہے)

© rasailojaraid.com